بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

آگے بڑھنے کے بجائے بات کی ڈور کا سرا ایک بار پھر پیچھے جا کر پکڑنا ہوگا۔

انتخابی کامیابیوں، ناکامیوں اور فوائد و نقصانات سے قطع نظر، ہمارا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ یہاں سیکولرازم نے خاصی پیش قدمی کر لی ہے۔ مسجدوں میں نمازیں بھی جاری ہیں، مدرسوں میں تفسیر و حدیث کے درس بھی ہو رہے ہیں، جلسوں میں وعظ اور تقریریں بھی جاری ہیں۔ کتابیں، رسالے اور پمفلٹ بھی چھپ رہے ہیں، جلوس اور مظاہرے بھی ہوتے ہی رہے ہیں، خالص تبلیغ کے ذریعے اسلام لانے والے گروہ بھی کام کر رہے ہیں۔ مشائخ کے اوراد و ادعیات بھی جاری ہیں — مگر سیاسی میدان میں، اقتدار کے میدان میں، ذرائع ابلاغ کے میدان میں، ادب اور فنونِ لطیفہ اور بے حجابی نسواں اور مخلوط ثقافتی تقریبات کے دائروں میں لادینیت (سیکولرازم) کی جو پیش قدمی ہو رہی تھی وہ حالیہ انتخابات کے بعد ابھر کر اس طرح سامنے آئی ہے کہ یوں لگتا ہے جیسے اس نے یک لخت ایک لمبی جست بھری ہو۔ مگر بات یہاں ختم نہیں ہو رہی، یہ نئے دورِ لادینیت کا آغاز ہے اور یہ آغاز نت نئے انڈے بچے دیتا رہے گا۔

سب سے پہلی چیز تو ہمارے نوٹس میں یہ آتی ہے کہ ہمارے ہاں جو آزادانہ اور منصفانہ انتخاب ۱۹۸۸ء میں منعقد ہو کر ایک نئے دورِ جمہوریت کا سبب بنے ہیں وہ کاملاً لادینی نوعیت کے انتخابات ہیں۔ ان میں ہر قسم کے لوگ — حتیٰ کہ مخالفینِ پاکستان بھی — ووٹر تھے، ان میں ایسے ایسے لوگ امیدوار

بنے اور کامیاب بھی ہو گئے، جن کی زندگیوں کے تاریک پہلو رسوائے زمانہ ہیں اور جن کی کسی علامت دین یا دینی علم و فکر کا کوئی ریکارڈ موجود نہیں ہے۔ اسی طرح وزارتوں پر جانے والے حضرات کے اسلامی فکر و کردار کے بارے میں کسی نے نہیں پوچھا۔ یہ بات محض دینی جذبے ہی سے نہیں کہی جا رہی بلکہ موجودہ دستور میں جو علماء کے متفقہ ۲۲ دستوری اصولوں کے مطابق نہیں ہے اور جس کی دفعات کے ساتھ اسلامی نظریاتی کونسل کا اتفاق بھی پوری طرح سے نہیں ہے، اس میں بھی اتنی اسلامی دفعات اور شقیں انتخابات اور امیدواروں اور کامیاب نمائندوں کے متعلق موجود ہیں کہ آج اگر کوئی عدالت ان کو سامنے رکھ کر حالیہ انتخابات کا جائزہ لے تو معلوم نہیں کیا نتیجہ نکلے۔ میرے محترم دوست محمد صلاح الدین صاحب نے ایسی تمام دستوری دفعات اور شقوں کو تکبیر (یکم دسمبر ۸۸ء۔ ص ۹ تا ۱۳ و بقیہ بر صفحہ ۲۲) میں شائع کر دیا ہے۔ بلکہ شاید ان کی طرف سے جناب خالد اسحٰق صاحب نے عدالتِ عالیہ میں رٹ بھی دائر کر دی ہے۔ اب یہ جائزہ لینا تو عدالت کا کام ہو گا کہ جناب صدر مملکت، جسٹس نصرت صاحب، وزارت و محکمۂ قانون اور ملک کے دانشوروں، ذرائع ابلاغ کے ارباب اور سیاسی لیڈروں نے دستور کے مندرجات و مشمولات سے اتنا تغافل کیوں برتا۔ سنجانے اب چارۂ کار کیا ہو گا؟

سیکولر انتخابات کے نتیجے میں بالکل سیکولر حکومت (اور اس کی اسمبلیاں) وجود میں آئی، جہاں اب تک نہ کسی مسئلے کے متعلق یہ سوال اٹھا کہ اس کے بارے میں اسلام کی رہنمائی کیا ہے اور نہ کسی معاملے میں اسلام کی رہنمائی کی طرف توجہ دلائے جانے پر کارروائی کا رُخ تبدیل ہوا۔

یہاں میں آپ کو ایک جھلک دکھاتا ہوں۔

۲۷ دسمبر کے اخبارات کے بموجب محمود الرشید صاحب نے تحریک پیش کی کہ بھٹو جو عدالتی نظام سے سزا یافتہ ہیں ان کے لیے شہید کا لفظ استعمال کرنا عدلیہ کی توہین ہے۔

آگے چلنے سے پہلے ذرا سا ایک جملۂ معترضہ ــــ کہ عدلیہ کو اس قسم کے معاملات میں توہین سے بچانے کا احسن طریقہ یہ ہے کہ قانون میں تبدیلی کر کے آئندہ کے لیے عدالتوں کو یہ طریقہ بنایا جائے کہ وہ جس کو بھی سزائے موت سنائیں، اس کے لیے فیصلے میں یہ لکھیں کہ ہم اس شخص کو شہادت کی موت کی سزا دے رہے ہیں۔

ہاں تو محمود الرشید صاحب کی تحریک پر دستور، قانون، ضابطہ کارروائی یا کم سے کم ضابطۂ اخلاق

ہی کے تحت کوئی اعتراض اٹھانے کے بجائے ڈاڑھیوں کے متعلق پیپلز پارٹی کے ایک رکن حزبِ اختلاف نے نہایت درجہ رکیک انداز میں اظہار نفرت کیا، پھر صوبائی وزیر افضل اعزاز کھڑے ہوتے تو اُن کو بدترین انداز میں گالی دی ـــــ انسانیت کے آخری نشان سے بھی یہ نمائندگانِ عوام نیچے اُتر گئے ـ یعنی توہینِ انسانیت بھی، توہینِ شریعت بھی اور توہین جمہوریت بھی ـ بعد ازاں ایک ہنگامہ برپا ہوگیا ـ اور بات کی صفائی کرنے کے بجائے محض کارروائی حذف کر دی گئی ـ سوال یہ ہے کہ شریعت کے شعار اور پیرویِ سنتِ رسولؐ کی ایک علامت کی توہین کی تلافی اتنی سی بات سے کیسے ہوسکتی ہے کہ کارروائی حذف کر دی گئی ـ خدا کے کاغذات میں لوگوں کے اقوال اور اعمال کون حذف کر سکتا ہے ؟

اسی طرح مولانا منظور چنیوٹی نے اخبارات ۲۹ دسمبر ۱۹۸۸ء ضیاء کے لیے دُعائے مغفرت کی تحریک کی ـ پھر ایک ہنگامہ برپا ہوا ـ تحریک نامنظور ہوگئی ـ

اِن مثالوں سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ لادینیت کس زور شور سے بڑھی آ رہی ہے ـ نہ قواعد کا لحاظ، نہ انسانیت کا خیال، نہ دین داری کی حس ـــــ بس جہاں کوئی مذہبی بات آئے، آج کل کے جنگی (MILLITANT) لادینیت پسندوں پر مرگی کا دورہ پڑ جاتا ہے ـ

رانا شوکت محمود (پی پی پی) نے بعد میں پنجاب اسمبلی کے ارکان کی ایک دعوت کی تو اس میں فرمایا کہ ملّا ازم کی پیداوار ارکانِ اسمبلی ماحول خراب کر دیتے ہیں ـ یہ "ملا ازم" کی اصطلاح جسے مغربی امپیریلسٹوں نے جا بجا مزاحمت کرنے والی دینی قوتوں کے خلاف گالی کے طور پر استعمال کیا تھا ـ اب اُن کے ذہنی غلام اس اصطلاح کو اس مقصد سے استعمال کرتے ہیں کہ یا تو اسلام ان کا "ملازم" بن کر رہے، ورنہ پھر ہم اسے ملّا ازم کا نام دے کر غضب و نفرت کا نشانہ بنائیں گے ـ اس طرح اصطلاحوں کو گالی بنا کر استعمال کرنا بُری بات ہے، ورنہ دوسرے لوگ بھی فرنگا ازم، مسٹنڈا ازم، لفنگا ازم، لفاٹیا ازم جیسی اصطلاحوں کو ایجاد کر کے عام کر سکتے ہیں ـ کیا انہیں یہ پسند ہے[1]؟

---

[1] توہینِ شریعت کے ان اذیت ناک واقعات پر بھی دینی حلقوں نے کوئی مؤثر ردِ عمل نہیں دکھایا ـ معلوم ہوتا ہے کہ ہر طرف ھُو کا عالم ہے ـ ع ـ اللہ رے سناٹا آواز نہیں آتی

رانا شوکت کو معلوم ہونا چاہیے کہ اسلام کی پابند زندگی سے ڈر کر جس ملّا ازم کو نشانہ تحقیر بناتے ہیں، اس سے وہ بچ کر کہیں نہیں جا سکتے ۔ دو دن وہ اچھل کود لیں، لوگوں کے خون بہا لیں، آخر پھر وہ دیکھیں گے کہ ملّا ازم سے نجات نہیں ۔ وہ ملّا ازم جس نے ایران میں انقلاب برپا کر دیا اور جس نے افغانستان میں ایک سپر پاور کو ناکوں چنے چبوا دیئے، پاکستان میں مدوجزر یا حوال کی وجہ سے ناموافق حادثات ہو سکتے ہیں، لیکن جب بھی کسی مخالف قوت کی چڑھی ہوئی آندھی ذرا تھمتی ہے تو پھر اسلامی رجحانات اس طرح نمودار ہو جاتے ہیں، جس طرح طوفانی موجوں کے تھمتے ہی روشنی کا مینار سارے کا سارا سربلند دکھائی دینے لگتا ہے ۔ اور آپ ملّا ازم کو جتنے زیادہ چرکے دیں گے وہ اتنا ہی زیادہ جلدی، زور پکڑے گا ۔ پھر آپ بے بس ہو جائیں گے ۔ اگر قرآن و حدیث زندہ ہیں اور ہماری تاریخ باقی ہے تو سمجھیے کہ تجدید و احیائے اسلام کے جذبے بھی اُمڈتے رہیں گے — تا آنکہ تبدیلی مکمل طور پر واقع ہو جائے ۔

جو لوگ گالیوں پر اُتر آتے ہوں وہ تو دلیل و اخلاق کے لحاظ سے اپنی کمزوری کا خود اعلان کر رہے ہوتے ہیں ۔

لادینیت کی بہت بڑی پیش قدمی کسی عورت کی حاکمانہ سربراہی کا واقعہ ہے جو موجودہ عالم اسلام میں پہلی مرتبہ نمودار ہوا ہے ۔ اور مغرب کی لادین تہذیب کے تسلط کے لیے سامراجی اور مخالفِ اسلام قوتیں جس چھینی کو اسلامی دین و معاشرت کی چٹان میں شگاف پیدا کرنے کے لیے بہترین سمجھتی ہیں وہ عورت ہے ۔ عورت کو پہلے دورِ نو گھر سے نکالتا ہے، پھر پردے سے باہر لاتا ہے، پھر زندگی کی تمام سرگرمیوں میں مردوں کے دوش بدوش لا کر مخلوط معاشرت پیدا کرتا ہے ۔ اتنا کچھ کام ہو جائے تو سمجھیے کہ لادینیت اور مغربیت (اور ضمناً عیسائیت) کے لیے بھی بہت خوشگوار ماحول تیار ہو گیا ۔ اگلا قدم عورت کو سیاسیات میں لانا ہوتا ہے، جس کی آخری حد یہ ہے کہ عورت صدارت و وزارت جیسے عہدوں تک پہنچ جائے ۔ اب گویا سیکولر ازم نے اپنا کھونٹا گاڑ دیا ۔ (جیسے کہ حال ہی میں نعوذ باللہ ایک جرمن اخبار نے پاکستان کے سیاسی تغیر پر یہ سُرخی لگائی کہ "خدا ایک عورت سے ہار گیا" (نعوذ باللہ

اِس جملے سے مغرب کی ذہنیت اور عورت کے مسئلے کا دین اور لادینیت کے لیے علامت ہونا آپ کے سامنے واضح ہو جاتا ہے۔

اتنا بڑا واقعہ ہو گیا، پیپلز پارٹی کی فتح سے بھی بڑا!

مگر اس واقعہ کا ایک تو سب کو پہلے سے اندازہ تھا اور دوسرے اس کے ہو جانے پہ لوگوں کی کثیر تعداد تعجب کا شکار ہو گئی۔ شروع شروع میں عام لوگ تو کیا، دینی حلقے بھی خاموش رہے۔ بس اکّا دُکّا آواز بلند ہوئی کہ یہ صورت خلافِ اسلام ہے۔

اُلٹا دوسری جانب سے یہ فاتحانہ آواز بلند ہوئی ہے کہ یہ واقعہ عالمِ اسلام کے اندھیروں سے نکلنے اور اُجالوں کی طرف عازمِ سفر ہونے کی نوید دیتا ہے کہ پاکستانی قوم نے تاریخِ اسلام میں پہلی بار ایک خاتون کو وزیرِ اعظم منتخب کر کے اُجالوں کی جانب قدم بڑھایا ہے۔ (ایک اخباری بیان)

پھر دوسری طرف بھی کچھ جھرجھری سی لی گئی۔ ایک نام مولانا سمیع الحق صاحب کا مجھے یاد ہے۔ دو ایک اور آوازیں بھی ہوں گی، مگر سرسری۔ بعد میں دینی رسائل میں نوٹ لکھے گئے۔

بعد میں عبدالعزیز بن باز اور چند علماء کے انفرادی فتووں کے علاوہ ایک مشترکہ بیان ۱۵ اصحاب کی طرف سے جاری ہوا۔ اس پورے عرصے میں سب سے زیادہ نعرہ دار تحریر "عورت کی سربراہی کا مسئلہ" آئی۔ اس وقت تک چہ میگوئیاں شروع ہو چکی تھیں، لیکن باقاعدہ سوچی سمجھی معتدل رائے جماعتِ اسلامی کی مجلسِ شوریٰ منعقدہ ۱۸ تا ۲۰ دسمبر ۱۹۸۸ء کی قرارداد "سیاسی صورتِ حال" میں سامنے آئی۔ الفاظ یہ ہیں:

"اضطراب کے اسباب کی فہرست میں ایک اور اضافہ خاتون کی سربراہی کا مسئلہ ہے جو مسلّمہ شرعی اُصول کی کُھلی خلاف ورزی ہے اور جس نے ملک اور عالمِ اسلام میں بے چینی پیدا کر دی ہے۔"

ستم یہ ہوا کہ عورت کی حاکمانہ سربراہی کا مسئلہ جس پہ صحابہؓ، تابعین اور تبع تابعین، اور ہر دور کے علماء کا اجماع چلا آ رہا ہے، اس کے متعلق جب بات چھڑی تو کوئی خطیب اور کوئی امام ایسے بھی تھے، جنھوں نے عورت کی حکمرانی کے جواز کے راستے نکالے۔ کچھ بین بین قسم کے حضرات تھے جنھوں نے یہ تو مانا کہ اسلام کی رُو سے یہ درست نہیں۔ لیکن جب معاشرے میں ہم دوسری خرابیوں کو قبول کرتے ہیں

تو یہ ایک اور سہی![1]

دراصل یہ واقعہ بھی سیکولر جمہوریت کا نتیجہ تھا۔ دینی لوگ جنہوں نے "جمہوریت جمہوریت" کی پکار تو زور شور سے جاری رکھی لیکن اس کے اسلامی تصور سے ذہنوں کو بیگانہ ہو جانے دیا، یا دوسرے لفظوں میں جتنا دعوتی چرچا جمہوریت کے لیے ہوا اتنا اسلامیت کے لیے نہ ہوا...... پھر اگر لادین جمہوریت نمودار ہوتی ہے تو اس کے بطن سے تو احوال کی وہی نسل چلے گی جیسے یورپ اور امریکہ میں دیکھی جاتی ہے۔

اس مسئلے پر ایسا نہ ہو سکا کہ فوری طور پر علماء کے مشترکہ اجلاس ہوتے، متفقہ فیصلہ کیا جاتا اور عوام کو رہنمائی دی جاتی۔ کوئی دستاویز تیار نہ ہو سکی، کوئی سیمینار اہلِ علم و فضل کا منعقد نہ ہو سکا، کسی اخباری فورم کا انتظام نہ ہو سکا، کوئی پمفلٹ نہیں اور..... بھی کچھ نہیں۔ بس "یک حرفِ کاشکے کہ بہ ہر جا نوشتہ ایم"

[1] کچھ حضرات جو ایک واقعہ کو دوسرے کے لیے نظیر بناتے وقت یہ نہیں سوچتے کہ دونوں واقعات میں عدم مماثلت کے کتنے وجوہ ہیں۔ وہ مادرِ ملت محترمہ فاطمہ جناح کے صدارتی انتخابات میں آنے کو آج کی صورتِ واقعہ کے لیے دلیلِ جواز بناتے ہیں۔ حالانکہ ان کا معاملہ یہ تھا کہ وہ اصطلاحاً "سن یاس" کو پہنچ چکی تھیں اور "مادرِ ملت" قرار پا چکی تھیں۔ ان کو لوگوں نے اضطراراً اُٹھایا کہ ایوبی آمریت کو توڑنے کے لیے کوئی دوسری مناسب شخصیت موجود نہیں، اور تیسرے یہ کہ انہوں نے یہ فیصلہ کر کے قدم اُٹھایا کہ میں حکومت نہیں کرنا چاہتی، صرف ضروری دستوری ترامیم اور بعد ازاں نئے انتخابات کرا کے واپس آ جاؤں گی۔ اِس کے لیے انہوں نے تین ماہ کی مدت تجویز کی تھی جس میں تھوڑا بہت اضافہ ممکن تھا۔ اس کا ریکارڈ بھی موجود ہے اور براہ راست تعلق رکھنے والے گواہ بھی! اس کے باوجود بھی بہت زور سے اعتراضات کیے گئے۔ ان میں جو مولانا مودودیؒ کے سامنے آئے، انہوں نے ان کے تفصیلی جواب دیے اور خاص طور پہ یہ بات کہی کہ اس اضطراری اور مخصوص الاحوال صورت کو عورت کی حکمرانی کے لیے اصولاً دلیل نہیں بنایا جا سکتا۔ کہاں مادرِ ملت فاطمہ جناح اور کہاں محترمہ بے نظیر۔

اِس معاملے میں علماء کو مشترکہ طور پر صاف اعلامیہ جاری کرنا چاہیے تھا کہ ایسی غیر شرعی صورت کو ہم ویسا ہی ناقابلِ قبول سمجھتے ہیں، جیسا آمریت یا دوسرے ممنوعاتِ دینیہ کو۔ مگر جبر و قوت پر قائم ایک واقعہ کو فوری طور پر اگر ہم بدل نہیں بھی سکتے تو ہم رائے عام کو اس کے خلاف تیار کر کے نئے حالات ضرور پیدا کریں گے۔

ذرا خیال فرمایئے کہ پچھلے کئی برسوں میں کوئی یہاں جرأت کر سکتا تھا کہ عورت کے حقِ حکمرانی کی آواز اُٹھائے۔ اسلام کے حق میں کمزور سی اتنی فضا ضرور تھی کہ یہاں صریحاً مخالفِ اسلام فیصلے اور اقدامات کرنا ممکن نہ تھا۔ اِس فضا کو برقرار رکھنے کے لیے علمائے پاکستان اور جماعتِ اسلامی کی بڑی ذمہ داریاں تھیں۔ افسوس کہ وہ فضا مزید مضبوط ہونے کے بجائے اُلٹا اور کمزور ہو گئی۔ اسی کمزوری کا نتیجہ یہ ہوا کہ دینی جماعتوں نے کسی معاملے میں اسلامی اُصول و اقدار پر زیادہ زور دیا ہی نہیں، بلکہ جمہوریت اور اتحادوں اور سیٹوں وغیرہ کے معاملات تک ساری مساعی محدود رہیں۔

بلکہ حد سے بڑھی ہوئی دیدہ دلیری یہ ہے کہ نفیس صدیقی صاحب نے اپنے مضمون میں محترمہ بے نظیر کو" حقیقی زندگی کا دیومالائی کردار" قرار دیا۔ (نوائے وقت ۵ جنوری ۸۹ء ص ۵ ک ۷،۸)

اس طرح کی قصیدہ خوانی ہمارے پورے دَورِ تاریخ میں نہیں ملتی۔ یہ الفاظ ہی دوسرے دائرے سے متعلق ہیں، اسلام سے کوئی واسطہ نہیں۔ صنمیات اور دیومالائی کردار صرف بُت پرست قوموں کے ہاں پائے جاتے ہیں جو خیالی ہوتے ہیں اور ان سے بسا اوقات نہایت واہیات کہانیاں وابستہ ہوتی ہیں اور وہ انسانیت سے کچھ ماورائیت کی شان رکھتے ہیں۔ یہ فقرہ تو بھارت کی مذہبی طرزِ فکر کے آگے ہمارے افکار کے سروں کو خم کر دیتا ہے۔

اور اس موقع پر ماہرِ تعمیرات نیر علی دادا (بہ روایت قدسیہ ہما) کا یہ حقیقت نما جملہ یاد آتا ہے کہ" یہ ایسی قوم ہے جو اپنے پر فخر کرنے کے بجائے خود کو مسترد کرتی ہے"! (نوائے وقت۔ اشاعت جمعہ ۱۳ر جنوری صفحہ ۲۲)

اس عالم میں جب اپنی کمزوری کی وجہ سے لوگ محسوس کرتے کہ ان کی غیرتِ دینی اور حمیتِ ملّی کے جذبوں پر ٹنوں وزنی چٹانیں رکھی ہوئی ہیں تو ان کے دل یہ چاہتے کہ" مردے از غیب بروں آید و کارے بکند"!

جناب پیر محمد ابراہیم ایک دن اٹھے اور اپنی فریاد لے کر کورٹ میں جا پہنچے اور اس مضمون کی رٹ دائر کر دی کہ مسماۃ بے نظیر بھٹو... عدالتوں سے سزا یافتہ باپ کو شہید قرار دے کر اور قومی ذرائع ابلاغ سے قاتل کو شہید کہلوانے کے جذبے میں پڑ کر توہینِ عدالت کی مجرم ہیں۔ لہٰذا ان کو عدالت عہدۂ وزارتِ عظمیٰ پر رہنے سے روک دے بلکہ وہ پارلیمنٹ کی رکنیت کی بھی اہل نہیں رہی ہیں۔ (روزنامہ جسارت ۸ جنوری ۱۹۸۹ء) - اس تلخیص میں نہ تو پوری بات آسکی اور نہ لفظ بہ لفظ خلاصۂ مدعا ہے۔ آج اس مضمون کو ختم کرنے کے بعد اخبار سے اطلاع ملی کہ یہ رٹ خارج کر دی گئی۔ (بحوالہ نوائے وقت و جنگ ۱۰ جنوری) - اہلِ علم و اہلِ دین کو آپ وہوا تو معلوم ہونی چاہیے۔

اب سرمایۂ تسکین ایک اور رٹ ہے جو زیرِ تیاری ہے۔ شنیدہ طور پر اس کا مضمون سیدھا سیدھا یہ ہے کہ عورت از روئے اسلام کسی اسلامی مملکت کی سربراہ نہیں ہو سکتی۔ اسے متعدد علماء مل کر داخل کریں گے جس کی سربراہی شاید مفتی محمد حسین نعیمی کریں گے۔ خدا کرے یہ کوشش مؤثر ثابت ہو۔

مگر راقم کا ذاتی احساس یہ ہے کہ پچھلے دس پندرہ سال کی کوتاہیٔ کار کے متعلق پوری ملت، اس کے علماء اور اس کے اداروں کے خلاف جو رِٹ تاریخ کی خدائی عدالت میں دائر ہے، سارے معاملے کا انحصار اس کے فیصلے پر ہے۔

اب آپ ذرا یہ دیکھیے کہ لادینیت کے شجرِ خبیثہ پر جب بہار آئی اور اسے ووٹوں کا پانی ملا تو ہر شاخ سے نئی کونپلیں اور شگوفے پھوٹنے لگے ہیں۔

محترمہ نصرت بھٹو فرماتی ہیں کہ ہماری جدوجہد استحصال، رنگ، نسل اور عقیدے کی تعریف سے پاک معاشرے کی تعمیر ہے۔ (جنگ ۴ جنوری ۸۹ء ص ۱ - کالم ۷، ۸) - چلیے عقیدے سے بھی چھٹی ہوئی ــــ جیسا منحوس استحصال، ناپسندیدہ عقیدہ ــــ عقیدہ اگر زندگی کے بڑے بڑے معاملات میں دخل نہ دے اور خدا و رسولؐ کا دین اگر سیاست و معیشت سے تعرض نہ کرے تو ایسے نیم جان بے ہوش عقیدے کا ہونا نہ ہونا برابر۔

یہ ہیں منتہا ان لوگوں کے!

دلچسپ یہ کہ اسی نظریے کی ایک دوسری تعبیر بھی ہے۔ ۱۲ جنوری کی شب ٹی وی پر فیض احمد فیض

کی ایک کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے مبصر نے کہا کہ اسلام اور اشتراکیت میں کوئی تضاد نہیں؟ سبحان اللہ۔ گھسی پٹی پرانی باتیں جو مسترد شدہ ہیں ان کو لاتے ہوئے یہ حضرات جھجکتے بھی نہیں۔ اگر کوئی کہہ دے کہ اسلام اور ہٹلرازم میں یا اسلام اور بام مارگی تحریک میں یا اسلام اور کفر میں کوئی تضاد نہیں تو پھر کیا رائے ہوگی؟

پچھلے دنوں آپ نے ایک انگریزی فلم کا ذکر سنا ہوگا جس کا عنوان تھا "پہلا پتھر کون مارے گا"۔ یہ فلم چپکے سے پاکستان میں بنی اور برطانیہ کے مشہور چینل ۴ سے ۱۲ دسمبر ۸۸ء کی شب اا بجے دکھائی گئی۔ کم ہی کسی کو یاد ہوگا کہ اس میں نہ صرف اسلام اور تعزیرات اسلام کا مذاق اڑایا گیا اور یہ بات ابھاری گئی کہ نفاذ اسلام سے عورتوں کے شرعی حقوق پامال ہوتے ہیں، نیز جنسی جرائم کی سزائیں وحشیانہ ہیں، بلکہ اس فلم کا اصل مقصد جواز "زنا" کی تحریک ہے۔ اب پاکستان میں اس سے لطف اندوز ہو جیئے!

ایک تصویر میں گورنر پنجاب کے تسمے باندھنے کے لیے ان کا پرائیویٹ سیکرٹری زمین پر گھٹنے ٹیکے ہوئے فرض ادا کر رہا ہے۔ اس تذلیل انسانیت کا بھی رشتہ بالآخر لادینیت سے جڑ جاتا ہے۔ کیونکہ یہ منظر اسلام کے خلاف ہے۔ (نوائے وقت۔ ۷ جنوری ۸۹ء۔ ص ۸ کالم ۶)۔

آپ کو یاد ہوگا کہ خبروں میں یہ بات اچھالی گئی تھی کہ دہلی سے روانگی کے وقت راجیو صاحب کے دائیں بازو پر "امام ضامن" باندھا گیا تھا۔ امام ضامن غلط ہو یا صحیح۔ اس کی روایت بہرحال مسلمانوں ہی کے مذہبی رسوم سے جڑتی ہے۔ متذکرہ خبر بڑی توہین آمیز ہے۔

سابق صدر پاکستان نے بڑی محنت سے قومی لباس کو اہمیت دلوائی تھی اور وہ اونچے طبقوں اور تقریبوں میں رائج ہوا۔ مگر اب پی پی پی کی جو پارلیمانی تقاریب حلف برداری وغیرہ ہوئیں ان میں انگریزی لباس ایک بار پھر فوقیت پا گیا۔ دوڑ پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تکبیر ۴ جنوری ۸۹ء۔ ص ۵۰)۔

اب یہاں میں فسادیانیوں کے پاکستان میں حالیہ ابھار کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں، جن کے لیے لادینیت کی فضا سازگار ہے۔

جٹان میں ابن نظام صاحب نے شکایت کی ہے کہ ڈرامہ سائے کی آخری قسط میں ڈاکٹر عبدالسلام

قادیانی کو دکھایا گیا۔ جنہیں مرزائی یہودی لابی کی سرتوڑ کوششوں سے نوبل پرائز ملا ہے۔ شکایت یہ ہے کہ مسلمان بچوں کے کچے ذہنوں میں اس شخصیت کو ٹھونسنے کی کوشش کی گئی ہے۔ (چٹان۔ جلد ۴۱، شمارہ ۴۵/۴۶۔ ص ۲۷)۔

سید عطاء المومن بخاری نے ایک انٹرویو میں یہاں کے تازہ حالات کے متعلق یہ کہا کہ دینی نقطۂ نگاہ سے اسلامی تشخص ختم ہو چکا ہے۔ اور پاکستان کا تشخص ایک سیکولر ملک کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ ساتھ ہی فرمایا کہ:

"مرزائیوں کی سرگرمیاں ۲۹ مئی کے بعد اچانک تیز ہو گئی ہیں۔ مرزا طاہر نے ۱۲ اگست کی تقریر میں کہا میں جنرل ضیاء الحق کو یہ اطلاع دے رہا ہوں کہ اس پر بھیانک عذاب آنے والا ہے۔ ۱۷ اگست کو ضیاء الحق کی شہادت کا سانحہ رونما ہوتا ہے ــــ نسیم احمد سابق سیکرٹری اطلاعات ۲۵، ۲۶ اکتوبر کو پاکستان آئے اور باقاعدہ پیپلز پارٹی کی امداد کی۔ روزنامہ الفضل کی اشاعت، سالانہ جلسہ کرانے کا اعلان اور صد سالہ جشن کا پروگرام ــــ اب مارشل لا کے بعض سیاسی قیدیوں کو چھوڑا گیا ہے، ان میں وہ قادیانی بھی شامل ہیں جنہوں نے سکھر میں خطیب مسجد کو شہید کیا تھا۔ (گفتگو محمود احمد قریشی شائع کردہ تکبیر۔ ۱۲ جنوری۔ ص ۲۰، ۲۱)۔

یہاں سید عطاء المنعم صاحب نے قادیانیوں کا جس طرح ذکر کیا ہے، مجھے اس کے ساتھ ہی اندیشہ پیدا ہوا کہ کہیں قادیانی .... ہمارے نظام کا لاافسروں، ملازمتوں اور اداروں میں نفوذ کر جائیں، کیونکہ ان کا دیرینہ پروگرام یہی زیر عمل رہا ہے۔ اسی کے ساتھ مجھے دوسری اقلیتوں کے بارے میں کسی فرقہ وارانہ احساس کے بغیر یہ خیال ہوتا ہے کہ دو چیزوں کا خیال رکھنے کی بہت ضرورت ہے۔ ایک یہ کہ ان کی آبادی کی رفتار اضافہ پر پوری نظر رکھی جائے، کیونکہ مسلمانوں کے خلاف کام کرنے والی یہودی اور عیسائی آبادیوں اور مشنریوں نے تو ایسے فیصلے کر رکھے ہیں۔ بعض مسلمان ممالک کو وہ آبادی + تعلیم کی قوت سے زیر نگیں بھی کر چکے ہیں۔ اب اگر ان حقائق کو سامنے رکھا جائے تو سوچنا چاہیے کہ اگر یہاں کی متعدد اقلیتیں ایک تو توالد و تناسل کے ذریعے آبادی میں اضافہ کریں، دوسرے ان کے لوگ باہر سے ناجائز طور پر داخل ہوں جیسے کہ پچھلے دو چار سال سے صورتِ حال ہے۔ اور پھر

چھپکے چھپکے تعلیم اور ذرائعِ ابلاغ وغیرہ میں نفوذ کرتے کرتے یکایک سر اُبھاریں تو ۵۰۰ سال بعد معلوم ہو کہ اُن کی مجموعی تعداد تو ۵۱٪ ہو چکی ہے۔ اور اکثریتی مسلمان جن کو خاندانی منصوبہ بندی کا تختۂ مشق بنایا جاتا رہا ہو، وہ ۴۹٪ تک پہنچ چکے ہیں تو نتیجہ کیا ہوگا۔ میں تو کہتا ہوں کہ ہمارے اندر بھی ایسے شدید اختلاف پسند اور متعصب گروہ ہو سکتے ہیں جو اقلیتوں کے ساتھ مل کر لادینیت کے محاذ کو مضبوط کرنا بہتر سمجھیں اور اصل مُسلم اکثریت کی شکست کو وہ پسند کریں۔ مثلاً ہمارے ہاں ہمارے عزیز بھائی شیعہ (+ اسمٰعیلی + بوہرے) موجود ہیں۔ کیا سرکاری طور پر اندازے ہیں کہ ان کو حکومتی لحاظ سے کتنا حصّہ حاصل ہے۔ اگر صرف پیپلز پارٹی ہی یہ بتا دے کہ اس نے کتنے سُنّی حضرات کو اور کتنے شیعہ حضرات (و خواتین) کو پارٹی ٹکٹ دیئے ہیں اور کتنوں کو حال ہی میں خاص خاص عہدوں پر تعینات کیا ہے (مثلاً حبیب بینک کے صدر نامزد کئے گئے ہیں صفدر عباس زیدی) تو اس وضاحت سے پوری قوم صحیح مگر نامعلوم صورتِ حالات سے واقف ہو جائے گی۔

یہاں کوئی مسئلہ فرقہ واری کا ہے، نہ منافرت کا۔ بلکہ اکثریت، اس کے کسی شدید اختلافی گروہ اور غیر مُسلم اقلیتوں کے حقوق کی صحیح تقسیم کا ہے (یعنی حصّہ بقدرِ تناسب)۔

اِس موقع پر یہ ذرا سی بات یاد دلا دینا مناسب ہوگا کہ جدّہ میں محترمہ وزیر اعظم جب پاکستانیوں سے خطاب کرنے پہنچیں تو "حسینیت زندہ باد اور یزیدیت مُردہ باد" کے نعرے بھی بلند ہوئے۔ یعنی اس گروہ نے اپنے وجود کو بڑی خوبی سے جتایا۔

مغرب کے ملحدانہ معاشروں میں جب تصورِ عدل بگڑا تو جرم پسندوں کی اکثریت رکھنے والے تمام مُلکوں میں جرائم کا نشانہ بن کر اذیت و مظلومی بھگتنے والوں کے بجائے مجموعی ہمدردیاں جرم کاروں کی طرف منعطف ہو گئیں۔ فلسفے میں، نفسیات میں، قانون میں، لٹریچر میں اور اخباری پروپیگنڈے میں ہر طرف یہ نیا رجحان اُبھر آیا۔ قدرتی طور پر اسلام جو سوسائٹی کو جرائم سے پاک اور شہریوں کو مطمئن و محفوظ رکھنا چاہتا ہے اس کے ہاں "وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَاةٌ" "نَكَالًا مِّنَ اللهِ" "خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا" "اَلسَدادِ فساد" جیسے منصوص اُصولوں پہ نظامِ عدل اور سزائے جرم قائم ہے۔ بعض اُمور میں معافی نہیں، تاوان نہیں، بعض میں معافی مظلوم فریق کے ہاتھ میں ہے۔ یعنی اسلامی

نظامِ عدل چاہنے والا معاشرہ حامیٔ مجرمین نہیں ہو سکتا - بلکہ حامیٔ جرم زدگان ہو گا - اگر یہ ترتیب اُلٹ جائے اور حمایت جرم کا رجحان نمایاں ہو جائے تو یہ مغرب کی لا دینی فکر و تہذیب کی شاہراہ پہ گامزنی کے مترادف ہوگا - ہماری حکومت نے بہت بڑے پیمانے پہ سزا یافتہ مجرمین کو جن میں انتہائی سنگین اور وحشت ناک کرتوت کرنے والے بھی ہیں، رہا کر دیا ہے[1] سزائے موت سزائے قید میں بدل دی ہے اور کچھ بڑے قیدیوں کی سزائیں کم کر دی ہیں -

حسب ذیل مثالوں کو سامنے رکھیے :-

کراچی سے پان ایم کا طیارہ اغوا کرنے والے ۵ فلسطینیوں کو رہا کر دیا گیا ہے -
مبتعوذ گروپ سے تعلق رکھنے والے سفاک قاتل گلاب کی رہائی -
کشمیری بازار کے بم کے دھماکے میں ملوث علی نٹ بالہ کی رہائی -
بدنام ڈاکو محمد خاں (۶۰ افراد کا قاتل) کی رہائی -
سانحہ حیدر آباد کے بدنام ملزم ڈاکٹر مدد علی و گلاب لکانی کی رہائی -
(تکبیر - ۲۲ دسمبر ۸۸ - ص ۷)

---

[1] آج کا اخبار بتاتا ہے کہ ۳۰۲ قیدیوں کی جاری شدہ فہرست میں سے ۵۴ نے بیرونِ ملک تخریب کاری کی تربیت حاصل کی - اور ۸۴ قتل اور دوسرے سنگین جرائم کے مرتکب ہیں - ان میں منشیات کی اسمگلنگ، بنک فراڈ، رہزنی، ڈاکہ زنی، قتل، زنا بالجبر اور غیر فطری فعل کے مرتکبین بھی ہیں - ایک شخص گیس کی پائپ لائن کو اُڑانے کی کوشش میں پکڑا گیا - ایک شخص بھارت سے تربیت پا کر امریکی حکام کو قتل کرنے پر مامور تھا - اس نے اسلام آباد میں آب پارہ مارکیٹ میں امریکی ٹورز کیمپ پہ ہینڈ گرنیڈ مارا - تین افراد وہ ہیں جو شیخ انوار الحق چیف جسٹس کو قتل کرنے پہ مامور تھے - ان کے سامنے دوسرے ججوں کے قتل کا پروگرام بھی تھا - محمد رفیق نے دو ٹائم بم نصب کیے، ایک ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل کے قریب، دوسرا ڈسٹرکٹ کورٹ کے قریب - کہا جاتا ہے کہ اس نے چوہدری ظہور الٰہی کے قتل میں امداد دی -
(نوائے وقت ۱۶ جنوری ص ۱ کالم ۶ - بقیہ ص آخر کالم ۴، ۵)

قومی اسمبلی کے قائد حزب اختلاف غلام حیدر وائیں نے نمائندہ چٹان کو انٹرویو میں بتایا کہ محترمہ نے سنگین جرائم کے ملزمان کو جو قتل، ڈکیتی اور دہشت گردی میں ملوث تھے، رہا کر کے بہت بڑی غلطی کی ہے ــــ ان میں سے زیادہ تر نے پاکستان کے خلاف دہشت گردی کی تربیت بھارت، افغانستان اور لیبیا سے حاصل کی ہوئی ہے ــــ انہوں نے ہزارہا پاکستانیوں کے خون سے ہولی کھیلی ہے۔ (چٹان - جلد ۴۱ - شمارہ ۴۵، ۴۶ - ص ۱۸) -

" واضح رہے کہ پیپلز پارٹی کی جانب سے کبھی بھی ذوالفقار تنظیم سے لاتعلقی کا اظہار نہیں کیا گیا۔ اور وہ لوگ جن کا تعلق الذوالفقار تنظیم سے تھا، انہیں رہا کیا گیا ہے۔" یہ باتیں پنجاب کے وزیر بلدیات و دیہی ترقی پرویز الٰہی نے اخبار نویسوں سے ۱۰ جنوری کو کہیں۔ (نوائے وقت - ۱۱ جنوری ص ۱ - کالم ۷، ۸)

محترمہ وزیراعظم کی رحمدلی سے مستفید ہونے والے مجرمین کی کل تعداد ۱۶۹۷۱ ہے - مارشل لاء کے تحت سزا یافتہ ۵۵۵ - موت کی سزا کی عمر قید میں تبدیلی ۲۰۲۹، خواتین اور ۶۰ سال سے زائد عمر کے مجرمین اور ۵ سال سزا بھگت چکنے والے مجرمین کی رہائی ۷،۳ - (تحریر محمد علی - خصوصی زائد اوراق ۴ جنوری ۸۹ء)[1]

مزید تفصیلات اخباروں میں بہت کثرت سے درج ہیں - ہم اس پر دو باتیں کہنا چاہتے ہیں کہ اولاً قتل کی سزا (موت) کے علاوہ متعدد ایسے جرائم ہیں جن کی سزائیں اگرچہ شرعی نہیں مگر کم از کم کسی طرح کی سزا ہونے سے ترک شریعت کے جرم میں کچھ خفیف سی کمی شاید آ جاتی ہو - بہر حال بہ حیثیت مجموعی بیشتر سزائیں مخالفت اسلام کی علامت ہیں اور پیروئی مغرب کا اظہار و اعلان - بلکہ صاف صاف اندیشہ یہ پیدا ہو گیا

---

[1] ایک طریقہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ جن سزا یافتگان کو رہا کرنا مطلوب تھا ان کے مقدموں کے کاغذات عدلیہ کے کسی بنچ یا کمیشن کو پیش کیے جاتے اور وہ اگر کسی کیس میں وجہ خاص دیکھتا تو تحقیق مزید کرتا۔ اسی طرح مارشل لاء کی عدالتوں یا سرسری سماعت کے تحت فیصل ہونے والے مقدمات کو عام عدالتوں میں از سرِ نو پیش کر کے فیصلہ حاصل کیا جاتا، مگر یہ تو عدل و جمہوریت کے لمبے راستے ہیں۔

ہے کہ شاید سزائے موت کو بالکل اُڑا ہی دیا جائے ۔ یہ فعلِ دینِ فرنگیت کی پیروی میں ایک امتیازی کارنامۂ ترقی ہوگا ۔ اگرچہ قرآن اور رسولؐ کے خلاف ہو ۔ ساتھ ہی ساتھ زنا کے جرم میں پکڑی ہوئی عورتوں کو رہا کرنے کے دوران میں ایسی بحثیں پیدا ہوئیں کہ مردوں کے لیے بھی اور عورتوں کے لیے خاص طور پر شریعت کی سزائے زنا — وحشیانہ ہے ، اسے ختم کیا جائے ۔ اس بہانے قانونِ شریعت کے خلاف جذبات کا ایک ریلا اُمڈ پڑا ہے ۔ اوپر ہم نے جس ظلم کا ذکر کیا ہے ، اُسے یاد رکھیئے ۔

دوسری بات ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ایک معاشرے میں یکایک سنگین جرائم کے مجرموں کی ایک بڑی تعداد کو چھوڑ دینا ایک طرف ان کے ہاتھوں اذیت پاتے والے گھرانوں کے بچوں، عورتوں اور بوڑھوں یا بے بس نوجوانوں کے لیے اذیتِ تازہ کا سامان ہوگا ۔ دوسری طرف مجرمین کا یہ لشکر از سرِ نو جرائم کا ایک طوفان اُٹھائے گا ۔ جو معاشرہ پہلے ہی جرائم پر قابو پانے اور ان کی افزائش کو روکنے میں ناکام ہو (خصوصاً سندھ میں) وہاں سزا یافتہ مجرموں کو چھوڑ دینا گویا شہری ریوڑوں میں بھیڑیوں کو چھوڑ دینا ہے ۔

ساتھ ہی یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ اگر ہر آنے والی حکومت اسی طرح سابق سزا یافتگان کو چھوڑتی رہے اور پھانسی پانے والوں کو شہید قرار دیتی رہے تو پھر کیوں نہ ایک ہی بار سرے سے مقدمہ چلانے اور سزا دینے کے سلسلے ہی کو ختم کر دیا جائے ۔ پولیس کو رخصت کر دیا جائے ، عدالتوں پر تالے ڈال دیئے جائیں ۔ جیلوں میں تعلیم گاہیں اور صنعت گاہیں قائم کر دی جائیں ، اس طرح ان شعبوں کا خرچ ختم ہو جائے گا اور بجٹ میں بڑی بچت ہوگی جسے ترقیات پر صرف کیا جا سکے گا ۔

اعزاز و اکرامِ مجرمین[1] کے متعلق زیادہ دلچسپ خبر (بحوالہ اُمن" ۴ جنوری ۸۹ء) یہ ہے کہ مخدوم خلیق الزمان نے ایک طویل بیان میں سندھ کے ڈاکوؤں پر مشتمل باقاعدہ "فورس" بنانے کا مشورہ دیا ہے ۔ دوسری طرف لاڑکانہ سے وزیرِ اعظم کے حوالے سے یہ خبر چھپی ہے کہ سندھ میں ڈاکوؤں کو عام معافی دینے پر غور کیا جا رہا ہے — ۱۹۸۶ء میں پاکستان آنے کے بعد جب بے نظیر صاحبہ لاہور سے جلسے جلوس کرتی ہوئی کراچی اور حیدر آباد کے بعد نواب شاہ پہنچی تھیں تو (بحوالہ نوائے وقت) رات کو ہونے والے

(باقی بر صفحہ ۴۳)

[1] اس سلسلے میں ایک چھوٹی سی دلچسپ خبر یہ بھی ہے کہ گورنر پنجاب جناب ٹکا خاں نے ۵۰۰ معافی یافتہ مجرموں کی دعوت کی ۔ کیا خبر آگے چل کر ان لوگوں کو تمغے اور ایوارڈ ملا کریں ۔

(بقیہ اشارات صفحہ ۱۵)

جلسہ عام میں حفاظت کے انتظامات ڈاکوؤں نے سنبھال رکھے تھے۔ کئی ڈاکو اسٹیج کے نزدیک موجود تھے۔ (تکبیر۔ ۱۹ جنوری۔ ص ۲۸، ۲۹)۔

لادینیت ہی کا لازمہ ہے کہ معاشرے میں مخالفِ شریعت ماحول بنانے کے لیے منکرات و فواحش کا زور پیدا کیا جائے۔

کچھ پہلے آرٹسٹوں کی ایک ملک گیر تنظیم اور بیورو آف آرٹس، کلچر و انسانی امور کے چیئرمین مجسمہ ساز مصور طاہر تلازہ نے سابق وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کا ڈیڑھ سو فٹ بلند مجسمہ تیار کرنے کا منصوبہ بنایا۔ مجسمہ ساز اور پیپلز پارٹی کے انفارمیشن سیل کے کنوینر علیم شاہ بخاری کے درمیان کنٹریکٹ طے پا گیا ہے۔ (تکبیر۔ ۱۲ جنوری ۸۹ء۔ ص ۵۰)

مسلم سوسائٹی صدیوں سے بہ حیثیت مجموعی بت گری اور بت پرستی سے نفور رہی ہے۔ خصوصاً برصغیر میں تو اس کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اس اشتغلے کا پہلا مطلب تو یہ ہے کہ بھٹو کی شخصیت کو لوگوں کے ذہنوں میں کیل کی طرح ٹھونکنا ہے۔ دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ بھارت کی صنم پرستانہ ثقافت کے اثرات کام کر رہے ہوں۔

ایک مجہول سی، بلکہ برائے نام تردیدی آواز بھٹو خاندان کے کسی نامعلوم فرد کی طرف سے آئی کہ وزیراعظم کا ایسا کوئی ارادہ نہیں۔ لیکن نہ تو متذکرہ آرٹسٹوں کی تنظیم اور بیورو نے اس کی تردید کی اور نہ پیپلز پارٹی کے انفارمیشن سیل کے کنوینر نے!

سالِ نو کا جشن مناتے ہوئے لاہور کی فیشن ایبل بستیوں اور فائیو سٹار ہوٹلوں میں گزشتہ سال سے بڑھ کر شرمناک مہنگا مہا نے عیش و طرب ہوتے۔ گلبرگ کے بیپی نیو ائرکی اخلاق باختگی کا سلسلہ ۲ بجے کے بعد شروع ہوا۔ سڑکوں پر شراب پیے ہوئے بے فکرے چھوکروں نے غل غپاڑہ مچایا۔ اسٹیڈیم سے باہر ایک فلمی اداکارہ کی کار کو گھیر لیا گیا، اُسے تنگ کیا گیا اور پھر ۱۲ آدمیوں نے کار کو اونچا اٹھا کر زمین پہ پٹخ دی۔ لبرٹی چوک میں بعض شرابی جوڑے رات شدید سردی میں نیم برہنہ ہو کر ڈانس کرنے لگے۔ نیو کیمپس پل پر بھی چند نوجوان جوڑے بدمستی اور خرمستی کے عالم میں سالِ نو کا خیر مقدم کرتے دیکھے گئے۔ بازارِ گناہ میں ایک

بالکونی پر پیپلز پارٹی کے جھنڈے کے سائے میں تین نیم عریاں میک اپ سے پر لڑکیاں سال نو کے خیر مقدم کے لوازمات کی منتظر تھیں۔ اداکار مصطفیٰ قریشی کے گھر اداکاروں اور اداکاراؤں اور رقاصوں نے کیک کاٹے۔ پیپلز کلچرل ونگ کے زیر اہتمام الحمرا میں ایک تقریب میں رانا شوکت محمود اور فخر زماں وغیرہ نے فلم سٹار دیبا اور بشریٰ انصاری وغیرہ کے ساتھ "سوہنی دھرتی والا" بھٹو کا پسندیدہ ترانہ گایا۔ (نکیر ۱۹ جنوری ص ۲۷، ۲۸)۔

فیشن ایبل گھرانوں کے ۱۵ لڑکے لڑکیوں کو راول ڈیم کے نزدیک جنگل میں منگل منانے اور شراب کے نشے میں مدہوش ہو کر انگلش دھنوں پر بریک ڈانس کرتے ہوئے پکڑ لیا گیا (بعد میں ان کے بڑے گھرانوں کے اثر و رسوخ کے زیر اثر چھوڑ دیا گیا) (جنگ ۳ جنوری ۸۹ء ص ۸۔ کالم ۷، ۸)۔

پروفیسر عبدالغفور صاحب کے بیان کے مطابق کراچی میں ۵ مقامات پر شرمناک طریق سے جشن منانے والے ہجوم دیکھے گئے۔

ضلع مظفر گڑھ کے ایک قصبہ جھوک سرور شہید میں ــــ پی پی پی کے رانا محمد اشرف دیگر پارٹی ورکروں کے ساتھ شراب کے نشے میں دھت ہو کر طالبات کے پرائمری اسکول میں گھس گئے اور استانیوں کے سامنے ناشائستہ رویہ اختیار کیا۔ ڈیوٹی پر موجود خاتون اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر کے کپڑے پھاڑے۔ پھر جب عوام مظاہرے کے لیے نکلے تو پیپلز پارٹی کے مسلح کارکنوں نے حملہ کر کے آٹھ آدمیوں کو زخمی کر دیا۔ مظاہرین پر اُبلتا ہوا گھی اور شیرہ پھینکا گیا۔ پھر آتش زنی بھی ہوئی۔ پولیس نے لاٹھی چارج اور آنسو گیس کا بھی استعمال کیا۔ آگے پھر پولیس یا قانون کیا کر رہا ہے۔ یہ سامنے آجائے گا۔

سنیما ہالوں کے باہر بڑے بورڈوں پر ناپسندیدہ پورٹریٹ نمودار ہو گئے ہیں۔

آئندہ پورے پورے تھانے عورتوں پر مشتمل بنائے جائیں گے۔

جمعہ ۲۳ دسمبر کی صبح کو (اشتہاری پوسٹر کے مطابق) نیشنل گارڈ روڈ ریس کا انتظام کیا گیا جو مزار قائد اعظمؒ سے شروع ہو کر وہیں ختم ہونے والی تھی۔

خالد محمود شوق کا مراسلہ بتاتا ہے کہ فیصل آباد کے مختلف سنیماؤں میں وزیر اعظم کے حلف اٹھاتے ہی عریاں اور فحش فلموں کے "ٹوٹے" دکھانے کا کام ایک منظم انداز سے شروع ہو گیا۔ (چٹان۔ جلد ۴۱۔ شمارہ ۵۔ ۴۵، ۴۶۔ ص ۳۵)۔

نوائے وقت کا سپورٹس رپورٹر لکھتا ہے کہ پنجاب یونیورسٹی انٹر کالجیٹ ہاکی چیمپئن شپ برائے خواتین کا انعقاد ہو رہا ہے۔ ۱۱ کالجوں کی ٹیمیں شرکت کریں گی۔ "مسیاں بھٹے کو تو ان" (نوائے وقت لاہور۔ ۱۱ جنوری ص ۴، کالم ۵)۔

نمونتہً یہ چند مجمل خبریں اس شہادت میں لائی گئی ہیں کہ لادینیت کے چمنستان میں تیزی سے گل کھلائے جا رہے ہیں۔

آٹھویں ترمیم کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ یہ بدنما داغ ہے۔

یہ ترمیم دوسرے پہلوؤں کے علاوہ کچھ ایسے دینی پہلو رکھتی ہے کہ لادینیت کی پیش قدمی میں وہ رکاوٹ بنتے ہیں۔ دوسرے وزیراعظم کو سابق دور (۱۹۷۰ تا ۱۹۷۷ء) کے مطابق ہمہ مقتدر ہو کر بلا روک ٹوک فسطائی اقدامات کرنے میں بھی آٹھویں ترمیم رکاوٹ ہے۔

پس آٹھویں ترمیم کے خلاف بھی سیاسی انجن میں زیادہ اسٹیم لادینیت ہی کی بھری ہوئی ہے۔ ماضیٔ قریب کی تاریخ کو وقت کے حکمران اگر بھلا بیٹھے ہوں تو ہم ان کو یاد کرا دیں کہ اس ترمیم کا وہ پہلو جو صدر اور وزیراعظم کے اختیارات میں توازن پیدا کرنے والا ہے وہ اس وقت کے اسلامی اتحاد کے عین مطالبے کے مطابق نمودار ہوا تھا۔ اس وقت یہ محسوس کیا گیا کہ ملی ٹینٹ (BRUTAL) اور اکثریت کی طاقت کے بل پر جب وزیراعظم کی واحد شخصیت ہی کلی اختیارات سمٹ آئیں تو نوبت اس قاتلانہ فسطائیت تک جا پہنچتی ہے جس کا تجربہ معاشرے کو ہو چکا ہے۔ اسی طرح مذہبی پہلو کی ترامیم جو آٹھویں ترمیم میں جمع ہیں وہ نظامِ مصطفےٰ کے لیے اٹھنے والے پُرزور مطالبے کے دباؤ کا نتیجہ ہیں۔

یہ عجیب صورت ہے کہ پہلے ایک فسطائی حرکت بلوچستان اسمبلی کو توڑنے کی کی گئی اور پھر اس کا حل نکالنے کے لیے اس سودا بازی کا سلسلہ شروع کر دیا گیا کہ دوسری طرف سے اگر آٹھویں ترمیم ختم کرنے (پیکیج ڈیل) میں ہمارا ساتھ دیا جائے تو بلوچستان کا مسئلہ ٹھیک ہو جائے گا۔ یعنی ایک فسطائی اقدام کے اثر سے بچنے کے لیے زیادہ وسیع فسطائی اقدام کرنے والی پاور دے دو۔

مولانا فضل الرحمٰن (جو بہت ۔۔ معاملات میں سیاسی کمپرومائیز کر لیتے ہیں) لکھتے ہیں یہ فرمایا ہے کہ "اس ترمیم سے بہت سے شرعی اور سیاسی مسائل وابستہ ہیں" ۔۔ "ہم ضیاء الحق کے اسلامی اقدامات کے مخالف نہیں تھے، ہمیں اختلاف صرف اتنا تھا کہ ان اقدامات پر عمل نہیں کیا گیا" (روزنامہ جسارت کراچی ۔ ۲ جنوری ۸۶ء)

مولانا وصی مظہر صاحب کا بڑا تفصیلی تجزیہ کارانہ مضمون اچھی طرح شائع ہو چکا ہے ۔ صلاح الدین صاحب بہت خوبی سے ترمیم کے نقطہ بہ نقطہ اور شوشہ بہ شوشہ مقاصد کو سامنے لا چکے ہیں ۔

بات تفصیل سے کی جائے تو بہت لمبی ہوگی ۔ مختصر قصہ یہ ہے کہ حسب ذیل امور کا تعلق آٹھویں ترمیم سے ہے ۔

۱ ۔ دستور ۱۹۷۳ء کی بحالی کا فرمان (۱۹۸۵ء)

۲ ۔ قرارداد مقاصد کو تنفیذی حیثیت دینے کا فیصلہ ۔

۳ ۔ پارلیمنٹ کے بجائے مجلس شوریٰ کے لفظ کا استعمال ۔

۴ ۔ حکومت کے رہنما اصولوں میں عشر کی وصولی کے نظام کی شمولیت ۔

۵ ۔ قادیانیوں کو اقلیت قرار دینے کے سابق فیصلے میں مزید استحکام ۔

۶ ۔ غیر مسلموں کے لیے جداگانہ انتخاب کے طریقے کا نفاذ (مطابق نظریۂ پاکستان)

۷ ۔ پارلیمنٹ اور صوبائی اسمبلیوں کی رکنیت کے لیے متعدد دینی و اخلاقی اوصاف کو لازم قرار دیا جانا ۔ (حالیہ انتخابات میں یہ دستوری فیصلہ معطل رہا) ۔

۸ ۔ عدالتوں سے اسلامی احکام و حدود (مطابق بہ قرآن و سنّت) کے تحت فیصلے حاصل کرنے کا حق ۔

۹ ۔ سپریم کورٹ میں شریعت بنچ کا قیام ۔

۱۰ ۔ وفاقی عدالت اور شریعت بنچوں میں ججوں کے ساتھ مستند و معتمد علماء کی شمولیت ۔

---

[1] مولانا فضل الرحمٰن صاحب ہی کا بیان ہے کہ ۱۹۷۳ء کا آئین متفقہ نہیں بلکہ پارلیمانی نظام کے لیے مستقل خطرہ ہے (جنگ ۱۶ جنوری ۔ ص ۱، کالم ۳) ۔

۱۱۔ اسلامی نظریاتی کونسل کے ارکان کی تعداد میں اضافہ، اور کسی عالم کو اس کا صدر بنانے کی گنجائش۔

۱۲۔ صدر کے انتخابی ادارے میں توسیع۔

۱۳۔ صدر کے اختیارات میں اضافہ۔

۱۴۔ جمہوری نظریہ نظر سے متعدد قابلِ تعریف اصلاحات۔

(مضمون مولانا وصی مظہر ندوی۔ تکبیر، کراچی۔ ۱۹ جنوری۔ ص ۳۵ تا ۴۲)۔

اب ان اجمالی نکات کو پڑھ کر اندازہ کیجیے کہ آٹھویں ترمیم کو اُڑانے کا مقصد کیا ہے، جس کے لیے کہا گیا ہے کہ ہم آرام سے نہیں بیٹھیں گے۔ مقصد اوّل یہ ہے کہ اسٹیٹ پوری طرح لادینی بنائی جا سکے۔ مقصد دوم یہ کہ پیپلز پارٹی اور اس کی محترمہ وزیر اعظم ہمہ مقتدر بن کر تمام قوانین و ضوابط کے پرخچے اُڑاتی ہوئی جو چاہیں کریں، کوئی پوچھنے روکنے والا نہ ہو۔ بھارت کے متعلق، روس کے متعلق، اپنی فوج کے متعلق اور مجرموں اور غنڈوں کے متعلق ہماری جس طرح کی پالیسی اب ہے، اس کی روشنی میں اندازہ کیجیے کہ "ہمہ مقتدر" ہونے کے بعد کیا کچھ نہیں ہو سکتا۔

اِن گذارشات سے یہ واضح کرنا مطلوب ہے کہ لادینیت کی آخری چوٹی سر کرنے کے لیے آٹھویں ترمیم کی رکاوٹ کو دُور کرنا ضروری ہے[۱]۔

بحث اتنی پھیل گئی ہے کہ میں مجبوراً دو ایک موضوعات کے جمع شدہ مواد کو درکنار رکھ کر چند سطور تحریر میں لاتا ہوں۔ یہ تو آپ کو معلوم ہے ہی کہ مسئلہ جہاد افغانستان کے بارے میں کیا کیا سازشیں ہو رہی ہیں۔ جینیوا معاہدے میں ذرا سی ایک کوتاہی (بہ دورِ جنیجو) ہو گئی جس نے سابق صدر پاکستان کو

---

[۱] آٹھویں ترمیم کے متعلق بعد از تحریر یہ بیان سامنے آیا کہ مسلم لیگ آٹھویں ترمیم کو دستور میں رکھنے کی حمایت نہیں کرے گی۔ (نوائے وقت۔ ۱۶ جنوری۔ ص ا کالم ۱، ۲)۔ خدا نہ کرے کہ لادینیت پسندی کے رجحانات دونوں کا قارورہ اس حد تک ملا دیں۔

شدید مضطرب کر دیا اور اسی کے نتیجے میں ۲۹ رمئی والا ناخوشگوار واقعہ پیش آیا۔

بنیادی طور پر تمام لادینی قوتوں کا مشترکہ ہدف یہ رہا ہے کہ افغانستان میں خالص اور مکمل اسلامی حکومت (وہی فنڈامنٹل ازم والی) نہ پنپنے پائے۔ امریکہ اور یورپی حلقوں کی طرف سے اس سلسلے میں مصر، سوڈان، الجزائر، الجیریا میں خاصے مؤثر تجربات ہو چکے ہیں۔ اور انڈونیشیا میں تو گویا حتمی کامیابی کی چوٹی پر جھنڈا گاڑنے میں ذرا ہی سی کسر ہے۔ ان سارے ممالک میں عیسائی مشنری قوتوں نے باقاعدہ حروب وصلیبہ کے جذبے سے ہر قسم کے طریقوں سے مہم چلا رکھی ہے۔ جس کا بڑا ہدف یہ ہے کہ عیسائی آبادی کو بذریعہ تناسل بھی اور بذریعہ باہر سے درآمد کے بھی اور بذریعہ پس ماندہ اور بت پرست قوموں میں تبلیغ کر کے بھی اتنا بڑھایا جائے کہ وہ چند سال (۵، ۱۰ یا ۲۰) میں اکثریتی مقام پر آجائیں۔ ورنہ کم از کم ایک بھاری اقلیت کی حیثیت سے اسلامی نظام کو برپا نہ ہونے دیں۔ اس مہم میں ان کو باہر سے سرمایہ، پروپیگنڈا، تعلیم وصحت کے ادارات، نوجوان کو خریدنے کے لیے زرِ ثمن اور آخری ضرورت کے لیے اسلحہ فراہم کیا جا رہا ہے۔ نیز مسلمان ممالک کو قرضوں اور اسلحہ کی ایڈ کی زنجیروں میں جکڑ کر ان کے درمیان ایک طرف اپنے سفارتی اور سازشی اکابر کو کارِ خفیہ اور کارِ سلطانیہ کے لیے بھیجا جاتا ہے؛ دوسری طرف عیسائی مشنریوں اور ان کے اداروں کے اور عیسائیوں کے لیے حقوق کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں ہر اسلامی اقدام پر عیسائی ہنگامہ آرائی کرتے ہیں، بیرونی پریس اسے اُچھالتا ہے۔ اور سپر پاورز آنکھیں دکھاتی ہیں اور ہمارے بادشاہ اور امیر اور وزیر دل مسوس کر رہ جاتے ہیں۔ بلکہ اکثر کا دل ہی چند سال میں ہَوا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ جن ممالک کو میں نے گنا ہے ان میں سے احیائے اسلام اور نفاذِ شریعت کی تحریکیں اس طرح بے رحمی سے کچلی جاتی ہیں گویا وہ مجرموں اور غنڈوں کے گروہ ہوں۔ کسی کی مجال نہیں کہ ذاتی اور گھریلو اور سہمی سہمی سی اسلامیت سے آگے بڑھ کر اجتماعی سیاست کی بات کرے۔

اب اس پس منظر کو ذہن میں رکھیے اور پھر میری بار بار کی کہی ہوئی اس بات کو تازہ کر لیجیے کہ ایشیا کی اس چھوٹی سی پٹی پر جس میں ایران، افغانستان اور پاکستان واقع ہے، اتنی کڑی نظر رکھی جا رہی ہے اور اتنی زیادہ اور علانیہ مداخلتیں کی جا رہی ہیں کہ آدمی کی سمجھ میں آتا ہے کہ عساکرِ شیاطین انسانوں کو کوئی کام کس طرح کرتے ہوں گے مغرب، ایران کے واقعہ کے بعد اس حال میں ہے کہ دودھ کا جلا، چھاچھ بھی پھونک پھونک کے پیتے — ایران تو گیا۔ اب وہ دیکھتے ہیں کہ فنڈامنٹلزم (اصولی اسلام) کا دوسرا "حادثہ" افغانستان میں ہونے والا

ہے۔ یہ ہو جائے تو پاکستان کو بھی اس سے بچانا ممکن نہیں ہے۔ بدیں سبب جنیوا معاہدے کے بعد تو ذرا کم؟ اور ضیاء الحق شہید کے رخصت ہونے کے بعد امریکہ، روس، بھارت اور ضمناً یہودی سب اچھل اچھل کر خوشی منا رہے ہیں کہ اب خطرہ ٹل گیا۔ خصوصاً یہاں ان کی پسند کی جو نئی حکومت قائم ہوئی ہے اس کی وجہ سے وہ مقامِ یقین تک پہنچ چکے ہیں۔ ان کے ساتھ پاکستان کے تمام لادینیت پسند اور سوشلسٹ اور مفاد پرست اور بیشتر غیر مسلم بھی شامل ہیں کہ افغانستان اور پاکستان سے اسلامیت کا خطرہ ٹل جائے۔

اب یہاں آکر دو راستے بن گئے ہیں:

ایک یہ کہ متذکرہ قوتیں یہ چاہتی ہیں کہ افغانستان میں ایک وسیع البنیاد حکومت قائم ہو، جس میں کابل گورنمنٹ کے اکابر بھی شریک ہوں، کمیونسٹ بھی ہوں اور مجاہدین سے غداری کرنے والے پٹھان بھی۔ ایسی صورت میں اسلامیت کے خطرے کا پوری طرح سدباب ہو جاتا ہے۔[1]

دوسرا راستہ یہ ہے کہ مجاہدین ایک عبوری حکومت قائم کریں اور وہ پھر چند ماہ میں انتخاب کرائے اور اس میں جو بھی لوگ کامیاب ہوں وہ دستور بنائیں اور آگے حکومت چلے۔ اس راستے کے حامی ضیاء الحق بھی تھے اور تمام محبانِ اسلام بھی اور مجاہدین افغانستان کو مظلوم اور برحق ماننے والے بھی۔

مگر یہ راستہ غلبۂ اسلام (فنڈامنٹلزم) کا راستہ ہے۔ اس راستے کی طرف روس، امریکہ اور بھارت میں سے کوئی بھی تیار نہیں۔ کیونکہ تینوں کے مفاد مارے جاتے ہیں۔ پھر پاکستان بھی ان کے ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔

واضح رہے کہ اس گڑبڑ کو کامیاب کرانے کے لیے حکومتِ پاکستان (اور قوم) کی مدد بڑی اہم ہے۔ لہٰذا روس اور بھارت کی تخریبی کارروائیوں کے ساتھ امریکہ کی سفارتی، جاسوسی اور دیگر سرگرمیاں زور شور

---

[1] بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ روس جو مختلف چالیں چل رہا ہے ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ شیعہ افغانوں کو جو ایران میں ہجرت کر گئے ہیں، وہ اُکساتا ہے کہ افغانستان کی اسلامی حکومت لازماً سُنّی ہوگی اس سے تمہیں آخر کیا ملے گا۔ تم اختلاف کرو۔ ابھی تک تو بظاہر روس کو کامیابی نہیں ہوئی۔ آگے خدا خیر کرے۔ اور اختلافات کی کچھ خبریں آ بھی رہی ہیں۔ اللہ رحم کرے!

سے جاری ہیں ۔

ایک تازہ خبر ملاحظہ ہو: "افغانستان میں صورتِ حال کو بہتر بنانے کے لیے پاکستان کو اقتصادی و فنی امداد کی پیش کش" (جنگ ۵ جنوری ۱۹۸۹ء ۔ پہلی سرخی ۔ صفحہ اوّل ۔ کالم ۵ تا ۸)

یہ صریحاً بین الاقوامی رشوت کی پیش کش ہے ۔

ایک خبر اور ۔۔ اے پی پی کی اطلاع کے مطابق اخباری اطلاع ہے کہ ظاہر شاہ کی جانب سے پاکستانی ویزا کی درخواست دی گئی ہے ۔۔۔ انہیں ایک بڑے جلوس کی شکل میں پشاور سے کابل لے جایا جائے گا ۔ پروگرام بنا لیا گیا ہے ۔ (ہمارا خیال ہے کہ اس جلوس کے قافلہ سالار ولی خاں ہوں، نائب سالار ان کی بیگم صاحبہ ہوں، اور سیاسی گارڈ پیپلز پارٹی کے جہانگیر بدر ہوں ۔ ن ۔ ص) ۔ یہ واقعہ ہوا تو روسی، امریکی اور بھارتی سازش میں پاکستان کے ملوث ہونے کا ناقابلِ تردید ثبوت ہوگا ۔ (تکبیر ۔ ۱۹ جنوری ص ۶، کالم ۲) ۔

گویا مختصراً یہ سارا کھیل بھی لنگار لادینیت کے غمزوں پہ ہو رہا ہے ۔

اسلامی نظریہ اگر کمزور ہوگا تو پاکستان کمزور ہوگا اور پاکستان کمزور ہوگا تو اسلامی نظریہ کمزور ہوگا ۔ اِس اصول کے مطابق بعض قوتیں براہ راست اسلام سے لڑنے کے بجائے تضعیفِ پاکستان (WEAKENING OF PAKISTAN) میں لگی ہیں ۔

سارک کانفرنس اس نیک کام کا خوب ذریعہ بنی ۔

۶ جنوری کے جنگ لاہور کا ص ۹ نکال کر بھارتی اخباروں کے انگریزی تراشے پڑھیے ۔ آپ کی آنکھیں کھل جائیں گی، خدا کرے کہ آنکھیں ہوں سہی ۔ ایس کے نہال سنگھ کا تعلق ہندوستان ٹائمز سے ہے ۔ نوٹ ہے: INDO PAKISTAN TIES ۔ مشہور صحافی چکراورتی کا مضمون ہے STRENGTHENING ۔ اور ایک اور مضمون ہے ۔ INDO PAKISTAN SUMMIT ۔ اس کا ایک فقرہ بس کرتا ہے ۔ BENAZIR'S PAKISTAN ۔ ویسے سب نے مسرتوں کا اظہار کیا ہے جس کی وجہ پی پی پی اور بھارت کے مشترک دشمن کا بیچ میں سے ہٹ جانا ہے ۔ ضروری فقرہ

یہ ہے کہ "بے نظیر کو مدد پہنچانے کی ضرورت ہے۔ ایک تو جرنلوں کے دباؤ کا خیال رکھنا ہے۔ دوسرے ضیاء الحق کے وارثوں کی طرف سے فنڈامنٹلزم آف پاکستان کا خطرہ ہے۔"

یعنی بھارت کی ہندو ذہنیت کے لیے پاکستان میں دو چیزیں ناپسندیدہ ہیں۔ ایک فوجی قوت جو اس کے راستے میں رکاوٹ ہے، دوسرے اسلام جس کے تحت دو قومی نظریہ وجود میں آیا اور تقسیمِ برصغیر واقع ہوئی۔

تضعیفِ پاکستان کے مظاہر تو یوں بھی سرِعام تھے۔ صلاح الدین صاحب لکھتے ہیں: "بینظیر نے امریکہ کے چکر لگائے، باقاعدہ تحریری درخواستیں گزاریں جو امریکی سینیٹ کی رپورٹوں میں شامل ہیں۔ وہاں سینیٹروں اور امریکی حکام سے ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رکھا۔ سولارز کو اپنی مہم کا نگران مقرر کیا[1]۔ لندن، پیرس، دہلی، ماسکو، کابل، کوپن ہیگن، ایمسٹرڈم، دمشق، طرابلس اور دنیا کے مختلف دارالحکومتوں میں عوامی اور حکومتی سطحوں پہ پاکستان کے خلاف زبردست مہم چلائی۔ جتوئی نے بھی امریکہ یاترا کا اہتمام کیا۔ ولی خان نے ماسکو اور دہلی کے چکر لگائے۔ جی ایم سید بھی پاکستان پہ حملے اور سندھ کے بھارت سے الحاق کی درخواست لے کر راجیو کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ ولی خان نے روسی فوجوں کی آمد اور اٹک پہ اس کے اقتدار کی زنجیر لگانے کی خبر سنائی۔ اصغر خاں نے بھی سُپر طاقتوں کا منظورِ نظر ہونے کا تاثر دیا۔ ضیاء الحق مرحوم نے خود یہ واقعہ سنایا کہ بھارت کے سفیران سے ملنے آئے۔ اور پیپلز پارٹی کے ایک رہنما کا نام لے کر جو کراچی میں مقیم ہیں اور حالیہ انتخابات میں قومی اسمبلی کے اُمیدوار بھی تھے، کہا کہ آپ کے سیاسی لیڈروں کا عجیب حال ہے کہ وہ ہمیں باقاعدہ حملے کی دعوت دیتے ہیں۔ انتخابی مہم کے دوران اور اس سے قبل سفیروں نے محض انفرادی ملاقاتیں نہیں کیں بلکہ وہ سیاسی جماعتوں کی عاملہ کے اجلاس میں شریک ہوتے۔ پریس کلب کی تقاریب، پریس کانفرنسوں اور جلسوں میں سیاسی قائدین کے دائیں بائیں بیٹھے نظر آئے۔ (تکبیر۔ ۲۲ دسمبر ۱۹۸۸ء۔ ص ۱۰ تا ۱۲)

---

[1] آج یہودی لابی کے یہی سولارز صاحب پاکستان میں آکر اپنی کارکردگی دیکھنے اور انسٹرکٹر کے طور پہ محترمہ بے نظیر اور محترم نواز شریف اور دوسروں کو ہدایات دینے اور معاملات ٹھیک کرنے آئے ہیں۔ نیز مسئلہ افغانستان کی پیٹھ میں چھرا گھونپنے۔ (خبر، جنگ ۱۲ جنوری۔ کالم ۱ تا ۵۔ ولیفیہ)

اُوپر بات سارک کانفرنس کی چھڑی تھی۔ اس کے متعلق مجملاً چند نکات :-

ا۔ پروٹوکول کا تقاضا تھا کہ سابق سربراہ مملکت کے متعلق فاتحہ یا اجتماعی اظہارِ غم کی قرارداد پیش ہوتی۔ بخلاف اس کے جن اکابر ممبران نے اپنا فرض سمجھ کر لب کشائی کی، ان کے لیے ہماری میزبان وزیراعظم کا ردِ عمل بڑا سخت تھا۔

۲۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کانفرنس دو دھڑوں میں تقسیم ہے۔ پاکستان اور بھارت ایک دھڑے میں اور بقیہ پانچ ممالک دوسرے دھڑے میں۔

۳۔ راجیو گاندھی اور محترمہ بے نظیر کی باہمی دوستی کا سبب ضیا دشمنی معلوم ہوتا تھا۔

۴۔ محترمہ نے شیخ مجیب الرحمٰن اور آنجہانی اندرا گاندھی اور جناب بھٹو کی خدمات کا ذکر کیا تو بنگلہ دیش کی تشکیل کا سارا نقشہ سامنے آ گیا۔

۵۔ غیر ملکی اکابر کو مزار ضیاء الحق پر نہیں جانے دیا گیا، بلکہ فیصل مسجد میں نماز پڑھنے کا موقع بھی نہیں دیا گیا۔

۶۔ جب تک کشمیر، سیاچن اور افغانستان کے مسائل طے نہیں ہوتے، بھارت سے خوشگوار تعلقات استوار نہ کیے جائیں۔

۷۔ پیپلز پارٹی نے بھارتی وزیراعظم کو غیر معمولی اہمیت دے کر دیگر ممالک کو ناراض کر لیا ہے۔ جب کہ اس سے قبل بھارتی بالادستی سے نجات کے لیے یہ ممالک ہمیشہ پاکستان کی طرف دیکھا کرتے تھے۔

۸۔ محترمہ وزیراعظم نے سارک کانفرنس کو پیپلز پارٹی کا جلسۂ عام بنا دیا۔

۹۔ چوتھی کانفرنس سارک میں پہلی بار فکری سطح پر بھارت کی بالادستی کو اگر کہہ کر نہیں، تو عملی طور پر قبول کر لیا ہے۔

۱۰۔ سارک کانفرنس میں مسئلہ کشمیر کو نظرانداز کرنے سے اہلِ کشمیر اور پاکستان کے محب وطن حلقوں میں شدید ردِ عمل ہوا ہے۔ مقبوضہ کشمیر کے مسلمان عوام کا اسلامی تشخص بگاڑا جا رہا ہے۔ انہیں اقتصادی طور پر نقصان پہنچایا جا رہا ہے۔[1]

---

[1] بھارتی سفیر جواب دیتا ہے کہ "مسئلہ کشمیر جیسے مسائل سارک کانفرنس میں پیش (باقی بر صفحہ آئندہ)

۱۱ - بھارت دریائے نیلم کو ایک سرنگ کے ذریعے دولر جھیل میں ڈالنے کا ناپاک منصوبہ بنا رہا ہے۔ کشمیر پاکستان کا مضبوط دفاعی حصار ہے۔

اِن اشارات کے مآخذ :-

ا - مضمون پروفیسر محمد سلیم - نوائے وقت -

ب - احباب کلب کی تقریب میں صدارتی خطاب (نوائے وقت - ۷ جنوری ص ا - کالم ۴، ۵، بقیہ ص ۷، کالم ۷)۔

ج - سردار عبدالقیوم (نوائے وقت - مورخہ ۱۱ جنوری، صفحہ آخر، کالم ۷، ۸ بقیہ بر ص ۷، کالم ۱)

د - سردار سکندر حیات - وزیر اعظم کشمیر (نوائے وقت - ۱۱ جنوری، ص ا، کالم ۴، ۵)

ر - قاضی سعید الرحمٰن، ڈاکٹر افضل اعزاز اور اشفاق سرور (پریس کانفرنس) (روزنامہ جنگ - ۱۱ جنوری، ص ۸، کالم ۱، ۲ بقیہ ص ۷ - کالم ۶ - نیز نوائے وقت - ۱۱ جنوری ص ۸، کالم ۴، ۵، بقیہ ص ۷ کالم ۴)۔

اِدھر جدہ سے ہماری وزیر اعظم کا بیان آیا کہ بھارت اور پاکستان کے درمیان موجودہ کشیدگی کا باعث کشمیر کا مسئلہ ہے۔ (جنگ ص ا - کالم ۶، ۷، ۸ - بقیہ ص ۶، کالم ۳)۔

اِس بیان نے جو پریشانی بھارت میں پیدا کی، اُس کا توڑ ہندوستان ٹائمز نے کر دیا۔ اس نے قوم کو مشورہ دیا کہ جدہ والے بیانِ کشمیر کو نظر انداز کر دینا چاہیے۔ (ایسی باتیں تو ہوتی ہی رہتی ہیں، نہ ہی) اخبار کہتا ہے، گو وہ منتخب وزیر اعظم ہیں لیکن ایک مضبوط فوج اور ایک بنیاد پرست (فنڈامنٹلسٹ) طبقہ اس موقع کی تلاش میں ہے کہ وہ کب کوئی غلطی کریں اور انہیں اقتدار سے ہٹا دیں۔ (جنگ ۴ جنوری ص ۸ - کالم ۴، ۵ - بقیہ ص ۷، ک ۶)۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ)

نہیں ہو سکتے "تو کیا یہ کانفرنس "نشستند و گفتند و برخواستند" قسم کی ہے۔ (نوائے وقت ۱۱ جنوری ص ا کالم ۴، ۵ - بقیہ ص ۷ کالم ۴)۔ اور بھارتی استاد کی اسی دلیل کو ہمارا شوکت محمود صاحب جیسے فہمِ فطین لیڈر نے دہرا دیا ہے۔ (جنگ ۱۶ جنوری، ص آخر، کالم ۴، ۵ -)

دو قومی نظریہ جو مسلمانوں اور ہندوؤں کی مذہبی اور تہذیبی اور تاریخی علیحدگی کے تصور پر ہی نہیں، عملی تجربوں پر مبنی ہے، اسے سارک کانفرنس کی پیدا کردہ فضا میں ضرب لگانے کے لیے بھارتی سفیر مسٹر ایس کے سنگھ نے ایک بیان میں کہا ہے کہ " پاکستان اور بھارت دو آزاد خود مختار ملک ہیں لیکن وہ مشترک ورثہ کے حامل ہیں۔ دراوڑ موہنجوڈرو اور ہڑپہ میں رہتے تھے اور پھر آرین اور مغل وادی سندھ میں آئے۔ ان سب کا خون ہم میں شامل ہے۔ زبان ہماری مشترک ہے (سفید جھوٹ ــ اُردو کو مسلمانوں کی زبان کہہ کر ہندی کو الگ زبان بنایا۔ ن۔ ص) شاعری مشترک ہے، موسیقی مشترک ہے، ہمارا ثقافتی ورثہ مشترک ہے۔ اس لیے ہمارا دوسرے ممالک کے مقابلے میں ملنا زیادہ مشکل نہیں ہے۔ (جنگ ۱۱ جنوری - ص ۱ کالم ۴، ۵ - بقیہ ص ۶، کالم ۳، ۴)۔

اس شخص کو لفظِ تہذیب و ثقافت کے معنی اور ان معنی کی وسعتوں اور گہرائیوں اور ان کی بنیادی رُوح کا شعور نہیں۔ بس ہماری نئی نسل کو جو ہندوؤں کی مُسلم آزاری کی تاریخ سے بے خبر ہے، ایک مغالطے میں ڈال کر اپنا اُلو سیدھا کرنا مطلوب ہے۔

سارک کانفرنس کے سلسلے میں پاکستان اور بھارت کے درمیان جو معاہدے ہوئے ہیں، ان میں سے اہم کا ذکر کیا جاتا ہے۔

ایک معاہدہ ہے کہ " فریقین ہر سال یکم جنوری کو اپنی ایٹمی تنصیبات کے حدود اربعہ سے ایک دوسرے کو آگاہ کریں گے [1] (تکبیر ۱۹ جنوری - ص ۱۵، ۱۶)

لیکن ہم جو معلومات بھارت کے حوالے کریں گے وہ ان کی (RANGE) میں ہوں گی، لیکن بھارت سے اگر صحیح معلومات بھی ملیں تو وہ ہماری پہنچ سے باہر ہیں۔ بھارت کے پاس ایسے میزائل ہیں جن کی مدد سے وہ جب چاہے پاکستان اور چین کو اپنا ہدف بنا سکتا ہے۔

دوسرا ہے ثقافتی تبادلے کا معاہدہ۔ پروپیگنڈے اور ثقافتی یلغار کے محاذ پر بھارت ہم سے

---

[1] چند روز پہلے کا واقعہ ہے کہ ایٹمی تنصیبات پر حملے کا منصوبہ اور درآمد شدہ سامان پکڑا گیا ہے۔ بالعموم بھارت ہی کو اس کا ذمہ دار مانا گیا ہے۔ اور کیسے معاہدے۔ (اداریہ جنگ۔ ۱۶ جنوری، ص ۳۔ کالم ۱، ۲)۔

آگے ہے۔ اس کی ثقافتی جنگ جاری ہے۔ بھارتی سفارت خانوں اور ٹیلی وژن کے ذریعے بھی یلغار کی جا رہی ہے۔ ہمارے نام نہاد ادیبوں اور دانشوروں اور فن کاروں کو بھارتی سفارت خانوں میں نوازا جاتا ہے۔ لادینیت پسند بھارت نے اگر بھرپور قسم کے ثقافتی طائفے بھیجے تو جواب میں کیا یہاں کے طائفے وہاں تبلیغ اسلام کریں گے۔

نشانِ عبرت ہے کہ اس معاہدے کے ساتھ ہی ہمارے ذرائع ابلاغ نے عربی کا بلٹن ختم کر کے ہندی کا شروع کر دیا ہے۔

بس یہاں ایک مثال بھارت کی ثقافتی اثر اندازی کی۔

ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں کہ پاکستان میں پچھلے دنوں ہندوستان کا ایک سفرنامہ "مندر میں محراب" کے عنوان سے شائع ہوا[1]۔ مصنف نے ایک منظم منصوبے کے مطابق یہ بات پھیلا دی ہے کہ اس میں اندرا گاندھی کی مخالفت کی گئی ہے۔ میں نے یہ کتاب پڑھی تو حیرت زدہ رہ گیا۔ مندر میں محراب کے مصنف تو اندرا گاندھی کو سیاسی ہیرو بنا کر پیش کر رہے ہیں۔ انہوں نے اپنی قومی غیرت ہی کا بلیدان نہیں دیا بلکہ مذہبی عقائد پر بھی ضرب لگائی ہے، اور اہانتِ اقبال سے بھی گریز نہیں کیا۔ (تکبیر۔ ۸ ردسمبر ۸۳ء۔ ص ۴۰)

اب چند متفرق اطلاعات۔

کراچی کی ایک تقریب میں معزز و معروف شخصیت جناب رشید چودھری کو پارٹی کے پروانوں نے زدوکوب کیا۔ اس واقعہ پر افراد اور اداروں کی طرف سے شدید ردِ عمل سامنے آ رہا ہے۔

دھمکیاں دینے کا عمل بھی شروع ہو گیا ہے۔ مثلاً کہا گیا ہے کہ اگر وفاقی حکومت کی مخالفت ختم نہ کی گئی تو ملک بھر میں دہشت گردی کا طوفان اٹھا دیا جائے گا۔

ایک دھمکی ایک ذمہ دار شخصیت نے یہ دی ہے کہ عنقریب اسلامی جمعیت طلبہ کا نام و نشان پنجاب

---

[1] واضح رہے کہ ترجمان القرآن کسی ادبی دھڑے بندی سے تعلق نہیں رکھتا۔ ایک حوالہ سامنے آیا وہ پیش خدمت ہے۔

یونیورسٹی سے ختم کر دیا جائے گا۔

بھٹو صاحب کی تصویر کو پہلے قائد اعظمؒ کی تصویر کی جگہ لانے کا پروگرام تھا، پھر ساتھ ساتھ رکھنے کا پروگرام بنا اور اب کرنسی نوٹوں پر قائد اعظمؒ کی تصویر کے بجائے بھٹو صاحب کی تصویر چھاپی جائے گی تاکہ اس کا اثر عوام اور خصوصاً آئندہ نسلوں پر ڈالا جاسکے۔ خیال رہے کہ سابق صدر شہید نے نہ کرنسی نوٹوں پر اپنی تصاویر چھپوانے کا اقدام کیا اور نہ یہ خواہش تک کبھی پیدا ہوئی کہ قائد اعظم کی طرح ان کی تصویر کو بھی مقام ملنا چاہیے۔

بیگم ضیاء الحق نے موجودہ حکومت کی طرف سے منظور کردہ خصوصی مراعات کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ معلوم نہیں یہ اخباری خبر کہاں تک درست ہے۔

حضرات گذشتہ اوراق میں ہم نے لادینیت کے عساکر کی پیش قدمی کو آپ کے سامنے پوری طرح واضح کر دیا ہے۔ اگرچہ لٹریچر، تعلیم، ذرائع ابلاغ وغیرہ کے پہلوؤں سے جائزہ لینا ممکن نہ تھا۔ اب آپ اپنا مقام بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔ کام کرنے میں مشکلات ضرور حائل ہوئیں لیکن دینی طبقوں کی اپنی کوتاہیاں بھی ہیں۔ ان کو خود احتسابی کی نگاہ سے دیکھنا چاہیے اور پھر نیا نقشہ جنگ مرتب کرنا چاہیے۔ اس سلسلے میں گذارشات انشاء اللہ تعالیٰ اگلی دفعہ!

یہ تحریر مایوس ہو جانے والوں کے لیے نہیں ہے، بلکہ جذبۂ تازہ کے ساتھ کام کرنے والوں کے لیے ہے۔

(باقی)